خواجہ الطاف حُسین حالؔی

(1837 ـ 1914)

حالؔی کی پیدائش پانی پت کے ایک شریف مگر غریب خاندان میں ہوئی۔ ان کا بچپن ہی تھا کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا پھر نوعمری میں شادی بھی ہوگئی لیکن حالؔی کو تعلیم کا اس قدر شوق تھا کہ شادی کے فوراً بعد یعنی 1854 میں وہ چپ چاپ دلّی چلے آئے اور اعلا تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے۔ گھر والوں کے دباؤ نے انھیں جلد ہی واپس لوٹنے پر مجبور کردیا۔ 1862 میں وہ دوبارہ دلّی آئے۔ اس بار مرزا غالبؔ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتؔہ سے ان کی ملاقاتیں رہنے لگیں اور وہ غالبؔ کے باقاعدہ شاگرد بھی ہوگئے۔ 1869 میں غالبؔ اور شیفتؔہ کی وفات پر حالؔی نے دلّی پھر چھوڑدی۔ اس بار وہ لاہور میں انگریزی حکومت کے ملازم ہوگئے۔

حالؔی کا لاہور پہنچنا اور محمد حسین آزادؔ کے ساتھ مل کر ڈاکٹر ڈبلیو۔جی۔ لائٹنر اور دوسرے انگریز افسروں کے ماتحت کام کرنا اردو ادب کے حق میں نعمت ثابت ہوا۔ حالؔی اور آزادؔ نے اردو میں نئی شاعری کی بُنیاد ڈالی جس کو انھوں نے "نیچرل" یعنی فطری شاعری کہا۔ پھر حالؔی نے بالکل نئے انداز کی سوانح عمریاں یعنی "حیاتِ سعدؔی" (1886)، "یادگارِ غالبؔ" (1897) اور "حیاتِ جاوؔید"

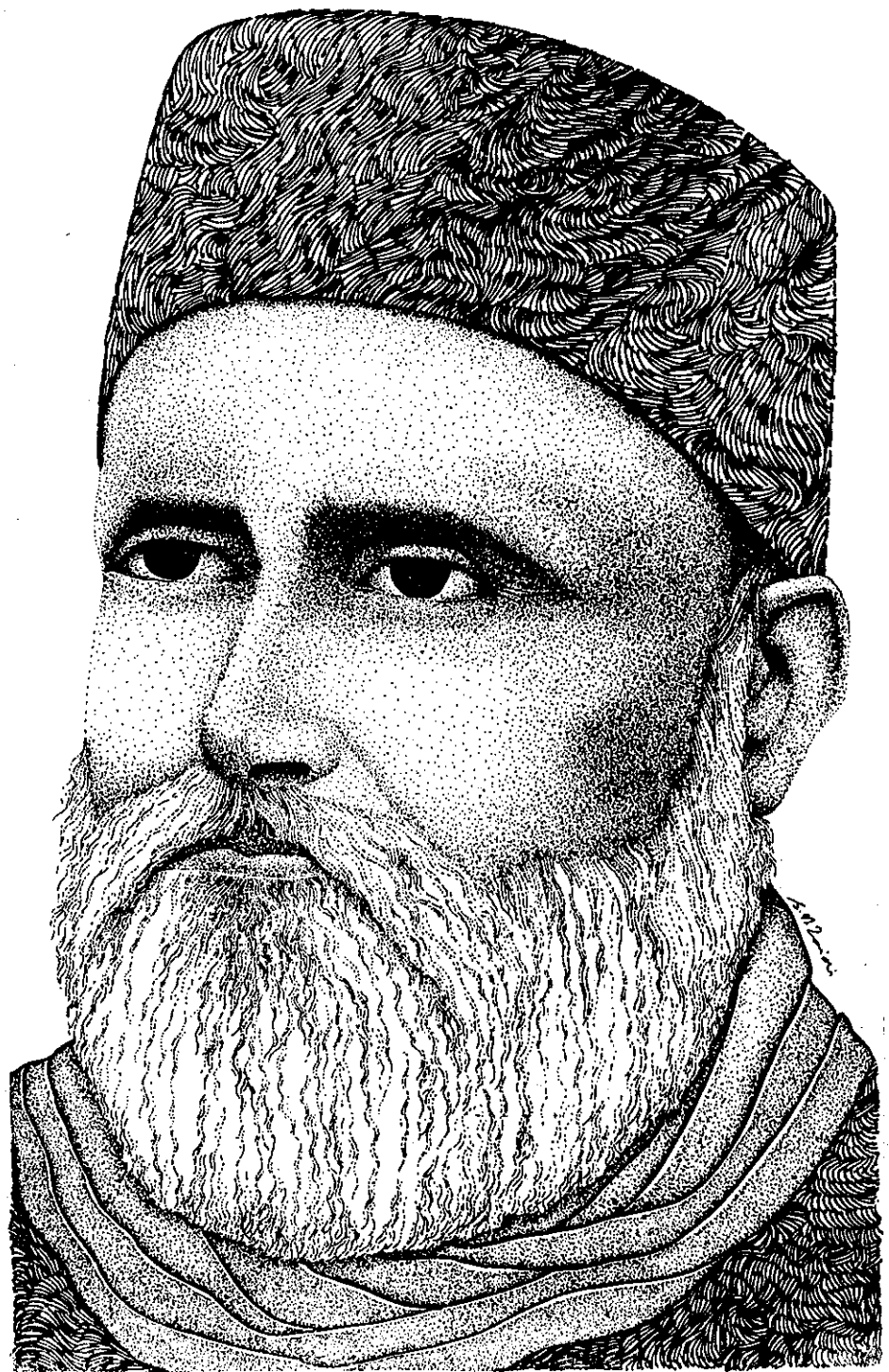

(1901) لکھ کر اردو ادب میں سوانح نگاری اور تنقید کے لیے نئے راستے نکالے۔ اس اثنا میں حالؔی کی شاعری بھی پروان چڑھتی رہی۔ ان کی دو طویل نظمیں "مسدّس حالی" (1879) اور "مناجاتِ بیوہ" (1884) بہت مشہور ہو چکی تھیں۔ غزل میں بھی انھوں نے سادگی اور سنجیدگیِ بیان کو فروغ دیا۔ 1893 میں انھوں نے اپنا دیوان شائع کیا۔ اس دیوان میں انھوں نے ایک مفصّل مقدّمہ لکھا جس میں انھوں نے شاعری کی ماہیت اور اردو شاعری کی خاص خوبیوں اور کمزوریوں کی طرف تفصیلی اشارے کیے۔ مقدمے کی بنیادی بات یہ تھی کہ شاعری کو مُلک و قوم کی اصلاح کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ حالؔی کے خیال میں چونکہ اردو شاعری کا بڑا حصّہ اخلاقی اور سماجی اصلاح کے کام نہ آسکتا تھا اس لیے انھوں نے ایسی شاعری کو بڑی حد تک نامنظور کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اب نئی طرح کی شاعری ہونی چاہیے تاکہ مُلک و قوم کی بھلائی کا سامان ہوسکے۔ حالؔی کا یہ مقدّمہ اتنا مشہور ہوا کہ بہت جلد ہی اسے الگ کتاب کے طور پر پڑھا جانے لگا۔ اس کتاب سے اردو میں نئی تنقید اور ادب کے بارے میں نئے خیالات کا آغاز ہوا اور "مقدمۂ شعر و شاعری" آج بھی اردو کی سب سے زیادہ بااثر تنقیدی کتاب ہے۔ حالؔی نے اپنے مقدمے میں بہت سی ایسی باتیں کہیں جن کا غلط اثر بھی پڑا، لیکن شاعری اور ادب کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر کے راستے انھوں نے ہی کھولے۔

مرزا غالبؔ کے حالات

صورت شکل

اہلِ دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا، اُن سے سُنا گیا ہے کہ عُنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور بُڑھاپے میں بھی جب کہ راقم نے پہلے ہی بار اُن کو دیکھا ہے، حُسانت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قِلّتِ خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و نزار ہوگئے تھے، لیکن چوں کہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے، اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

اولاد

مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچّے پے در پے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس لیے ایک مدّت سے وہ اور ان کی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر غدر سے چند سال پہلے جب کہ ان کی بی بی

کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوگیا اور ان کے دونوں بچّے ایک باقر علی خاں اور دوسرے حسین علی خاں صغیر سِن رہ گئے تو مرزا اور ان کی بی بی نے چھوٹے لڑکے حُسین علی خاں کو جو اس وقت بہت کم عمر تھا، اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ مرزا، حُسین علی خاں کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ ناز برداری کرتے تھے۔

جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا تو حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی خاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ دونوں خوش فکر اور اہل اور نیک خو اور نہایت شریف مزاج تھے۔ مگر افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہوگئے۔

حالاتِ غدر

غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے، بلکہ گھر سے، باہر نہیں نکلے۔ جوں ہی بغاوت کا فتنہ اٹھا، انھوں نے دروازہ بند کرلیا اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کیے۔ اگرچہ فتحِ دہلی کے بعد مہاراجہ پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور اُن کے ہمسایوں کے مکان پر جس میں ایک مرزا بھی تھے، حفاظت کے لیے پہرہ بیٹھ گیا تھا، اس لیے وہ فتح مند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے۔ مگر پھر ان کو طرح طرح کی کُلفتیں اٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہوگئے تھے اور اخیر دم تک اسی حالت میں رہے۔ جب مرزا نے دلّی میں سکونت اختیار کی، تو ان کو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے ان کا مکان تقریباً دو ہزار قدم

کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز کہ دونوں عمر رسیدہ تھے، ان کے پاس رہتے تھے۔ جب دلّی فتح ہوگئی اور شہر اہلِ دہلی سے خالی ہوگیا اور رَستے بند ہوگئے، اس وقت مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے، سونے مرنے اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی۔ ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاہی گھس آئے تھے اور جو کچھ اسباب ملا، لے گئے۔ پھر ایک دن وہی بڈّھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا، یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہ کر آج آدھی رات گزرے، مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت نہ کفن کے لیے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا، نہ غسّال اور گورکن کا کہیں پتا تھا، نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا، مگر مرزا کے ہمسایوں نے ان کی بڑی مدد کی۔ پٹیالے کی فوج کے ایک سپاہی کو جو حفاظت کے لیے تعینات تھا، اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور مرزا صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لے کر مرزا یوسف کے مکان پر پہنچے اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے، مسجد کے صحن میں، جو مکان کے قریب تھی، دفن کر دیا۔

چونکہ اس وقت مسلمانوں سے شہر خالی ہوگیا تھا، مرزا کے ہندو دوستوں کے سوا، جو اُن کے پاس برابر آتے رہتے تھے اور ہر طرح سے ان کی غم خواری کرتے تھے، کوئی ان کا غم خوار نہیں رہا تھا۔ مرزا کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے: سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ، سو یہ دونوں ذریعے مسدود ہوگئے تھے۔ شہر کے تمام مسلمان عمائد جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے، اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے۔ اس کے سوا گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا اور کوئی قیمتی چیز تھی، جب شہر لُٹنے لگا تو وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لیے بھیج دیا،

جہاں سے فتح مند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا۔ مرزا نے اس تنگی اور عُسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدّد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا اور جو حالت ان پر اور ان کے متعلّقین پر خوش و ناخوش گزری، اس میں نوکر بھی برابر شریک رہے۔ نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے، وہ اس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار ناچار ان کی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا، سب بیچ بیچ کر کھا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔

حُسنِ بیان اور ظَرافت

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے، مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسنِ بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا: "مرزا! تم نے کتنے روزے رکھے؟" عرض کیا: "پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔"

لطیفہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے، وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی، جس کا دَر اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جُھک کر جانا پڑتا تھا۔ اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اُسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقیّد رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردّد پیدا ہوگیا۔ مرزا نے کہا: "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقیّد رہتا ہے، وہ یہی کوٹھری تو ہے!"

لطیفہ

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چُرٹ میں سوار، مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رُقعہ دیوان جی کو لکھا۔ مضمون یہ ہے کہ "آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہوسکتی

ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔"
جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا، وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

لطیفہ

حکیم رضی الدین خاں، جو مرزا کے نہایت دوست تھے، ان کو آم نہیں بھاتے تھے، ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا: "دیکھیے، آم ایسی چیز ہے، جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔" مرزا نے کہا: "بے شک، گدھا نہیں کھاتا۔"

معنی اور اشارے

حُسانت = خوبصورتی، خاص کر ایسی خوبصورتی جس میں اچھائی کا پہلو بھی ہو۔

ہاڑ بہت چکلا = سینہ اور کندھے چوڑے اور نمایاں

غدر = اس لفظ کے صحیح معنی ہیں: ملک یا قوم کے ساتھ دغابازی کرنا۔ خاص کر جب اس میں سپاہیوں یا فوجوں کی طرف سے دغابازی اور ہتھیار اٹھانا شامل ہے۔ 1857 میں جب ہندوستانیوں نے

انگریزوں کے خلاف اپنی آزادی کا جھنڈا بلند کیا تو انگریزوں نے اسے Mutiny کا نام دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی ہندوستانی بھی اس واقعے کو "غدر" کہنے لگے۔ اب ایسا کہنا مناسب نہیں۔

چونکہ اس وقت مسلمانوں سے شہر خالی ہو گیا تھا = 1857 کی لڑائی میں انگریزوں کے خلاف لڑنے میں مسلمان پیش پیش تھے۔ دلّی پر دوبارہ فتح پانے کے بعد انگریزوں نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ مسلمانوں کے سیکڑوں محلّے ویران کروا دیے اور ان کو شہر سے باہر نکلوا دیا۔ تقریباً دو سال بعد مسلمانوں کو پرمٹ دیے جانے لگے کہ وہ شہر میں آ جا سکتے ہیں۔

چُرٹ = دو پہیوں کی کھُلی ہوئی گاڑی یہ لفظ انگریزی Chariot سے بنا ہے۔ اس کی ایک شکل Charet بھی ہے۔

عمائد = یہ لفظ "عمدہ" کی جمع ہے۔ عربی میں اس کے معنی ہوتے ہیں: ستون یا کھمبا، جس پر کوئی چیز قائم ہو۔ اس اعتبار سے عمدہ اور عمائد کے معنی ہو گئے: رئیس اور باحیثیت لوگ۔

حیوانِ ناطق کے بجائے حیوانِ ظریف = حیوانِ ناطق کے معنی ہیں: وہ جاندار جو الفاظ کے ذریعے بول سکتا ہو۔ انسان کی یہ تعریف پرانے

یونانیوں اور عربوں نے بنائی تھی۔ مرزا غالب چونکہ بہت ہنسوڑ شخص تھے، اس لیے حالی کہتے ہیں کہ ان کہ حیوانِ ظریف یعنی وہ جاندار کہا جائے جو ہنس سکتا ہے۔

غور کرنے کی بات

"ایک دربان اور ایک کنیز کہ دونوں عُمر رسیدہ تھے"۔ یہاں پر "کہ"، "جو کہ" کے معنی میں آیا ہے۔ اس طرح کے "کہ" کو "کافِ بیانیہ" کہتے ہیں۔ اس کے پہلے آپ "کافِ مُساوات" کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔

آگے آپ شبلی نعمانی کی تحریر پڑھیں گے۔ اگر آپ مولانا حالی کی تحریر کا شبلی نعمانی کی تحریر سے موازنہ کریں تو دیکھیں گے کہ شبلی کی تحریر میں کسی عالم و فاضل شخص کے بے تکلّف درس دینے کا انداز ہے۔ یعنی شبلی کی تحریر بہت رواں اور شگفتہ ہوتی ہے، لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا طالب علموں سے خطاب کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف، حالی کی تحریر کا انداز کچھ ایسا ہے جیسے وہ آپ کو سامنے بٹھا کر بات کر رہے ہیں، لیکن درحقیقت وہ اپنی باتوں میں گم ہیں۔ حالی کے یہاں ایک طرح کی محویت ہے تو شبلی کے یہاں خود آگاہی ہے۔ دونوں ہی اپنے پڑھنے والے کو "تم" سے مخاطب کرتے ہیں (یہ اس زمانے کا رواج تھا)، لیکن حالی کے یہاں سادہ بے تکلّفی ہے اور شبلی کے یہاں بے تکلّف برتری کا انداز۔ دونوں اپنی اپنی طرح کے بڑے نثر نگار ہیں۔

غالب کی تصویر کشی میں حالی نے غالب کی بُرائیوں کو نظر انداز نہیں کیا

ہے، لیکن ان کو ذرا ہلکے رنگ میں بیان کیا ہے۔ حالی کے برخلاف محمد حُسین آزاد جس کسی کا حال بیان کرتے ہیں (ذوق کے علاوہ) اس کے بارے میں ایسی باتیں یا چُبھتے ہوئے جملے اور واقعات ضرور لکھتے ہیں جن سے اس شخص کی کسی کم زوری یا بُرائی پر کچھ طنزیہ سی روشنی پڑ جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد کے مزاج میں شوخی ہے، حالی کے یہاں متانت۔

حالی کے یہاں لمبے لمبے جملے اکثر ملتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کی عبارت اتنی مربوط ہوتی ہے اور بات کو اس طرح کھول کھول کر کہتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اُلجھن نہیں ہوتی۔ لطیفہ اور واقعہ بیان کرنے میں محمد حسین آزاد اور حالی دونوں کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں سے کام لیتے ہیں۔

مشق اور مطالعہ

(1) غالب کے خط اور مولانا حالی کے بیانات آپ نے پڑھے ہیں۔ اب ان کی روشنی میں غالب کی شخصیت پر مضمون لکھیے جس میں زیادہ سے زیادہ تین سو الفاظ ہوں۔

(2) محمد حسین آزاد اور حالی کی تحریروں میں سے تین لطیفے چھانٹ کر ان کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

(3) غالب نے "آم" پر ایک نظم بھی لکھی ہے۔ اگر آپ کی لائبریری میں "دیوانِ غالب" ہو تو اس میں یہ نظم دیکھیے۔